محمد خالد مسعود

فقہ الاقلیات

''بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے زیرِ اہتمام ''اجتہاد'' کے موضوع پر مذاکرے کی ایک نشست میں ۲۱/ مارچ ۲۰۰۵ء کو پیش کیا گیا۔'' [ایڈیٹر]

آج کی دُنیا میں مسلمانوں کی ایک تہائی سے زیادہ آبادی غیر مسلم ممالک میں سکونت پذیر ہے، اس صورتِ حال نے بہت سے نئے مسائل کو جنم دیا ہے۔ یہ مسائل غیر مسلم ممالک کے بھی ہیں اور ان ممالک میں سکونت پذیر مسلمانوں کے بھی۔ لیکن ان مسائل کی ایک جہت ایسی بھی ہے جو دُنیا بھر کے مسلمانوں کو دعوتِ فکر دیتی ہے۔ امتِ مسلمہ کے علماء کی اکثریت غیر مسلم ممالک میں رہائش پذیر مسلمانوں کو اقلیت قرار دیتی ہے۔ ان کے مسائل کو اسی حیثیت سے دیکھتی ہے۔ اہلِ علم کی ایک بہت بڑی تعداد اس بات کی قائل ہے کہ ان مسلمانوں کے لیے فقہی مذاہب کی تقلید لازمی ہے، بالکل اسی طرح جیسے وہ ان ممالک میں ہجرت سے پہلے کرتے تھے۔ اس سوچ کے مطابق امت کا ایک لغوی معنی مادرِ وطن کے مفہوم میں اُبھرا ہے یعنی غیر مسلم ممالک میں رہائش پذیر مسلمانوں کا مادرِ وطن سے تعلق۔ اکثر اوقات اس سے مراد وہ ملک یا ممالک ہیں جہاں سے ہجرت کر کے یہ لوگ ان غیر مسلم ممالک میں آئے ہیں اور بعض اوقات اس سے مراد پڑوس کے ممالک ہیں جو تاریخی طور پر مادرِ وطن قرار پاتے ہیں اور بالعموم اس سے

مراد فکری و ثقافتی اُمومت کا رشتہ ہے جو جغرافیائی حدود سے بالاتر رہتا ہے۔

ان مادرِ وطن مسلم ممالک سے، خواہ ان کا یہ مادرانہ رشتہ نسلی و ثقافتی ہو یا تاریخی، توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان اقلیات کو اسلامی طرز سے زندگی گزارنے میں سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی مدد فراہم کریں۔ اس توقع سے مسائل میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ اس کا ایک مظہر تو عید تہوار وغیرہ کا اختلاف ہے کہ مسلمان آبادیاں مقامی رویتِ ہلال کی بجائے اپنے مادرِ وطن کی رویت کو زیادہ معتبر سمجھتی ہیں اور اسی کے مطابق تہوار مناتی ہیں۔

اس سے یہ تاثر بھی اُبھرتا ہے کہ یہ مسلمان آبادیاں دراصل ان مختلف ممالک کی نوآبادیات ہیں اور وہیں کی ثقافت اور قوانین پر عمل پیرا ہیں۔ حتیٰ کہ بعض ممالک میں تین تین نسلیں گذرنے پر بھی مادرِ وطن سے وابستگی اپنی پوری گہرائی کے ساتھ موجود ہے۔ یہ تاثر اس تصور کے ساتھ جڑا رہتا ہے کہ ان کا قیام عارضی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ یہ احساس کہ مسلمان کبھی بھی کسی غیر مسلم ملک میں مستقل طور پر رہائش اختیار نہیں کرسکتا۔ اس عقیدے کو تقویت بخشتا ہے کہ دُنیا واضح طور پر دارالاسلام اور 'دارالکفر' دو حصوں میں تقسیم ہے۔

اس بات سے قطع نظر کہ آیا دارالکفر میں رہائش پذیر یہ مسلمان آبادیاں دارالاسلام کی طرف ہجرت کرنے کے لیے تیار ہیں اور آیا دارالاسلام ان آبادیوں کو سنبھال لینے کی صلاحیت رکھتا ہے اور آیا مسلمان دارالاسلام کے مختلف ممالک میں مکمل آزادی سے نقل وحرکت کر سکتے ہیں؟ اس طرزِ فکر نے اس سے بھی زیادہ اہم، پیچیدہ اور فکر طلب سوالات پیدا کیے ہیں۔

جدید سیاسی اور اقتصادی بین الاقوامی حالات ان حالات سے یقیناً مختلف ہیں جن کے تناظر میں فقہاءِ کرام نے دارالاسلام اور دارالکفر کی اصطلاحات اور ہجرت کے احکام ترتیب دیئے تھے۔ آج کے دور میں یہ اصطلاحات اور احکام مبہم ہو کر رہ گئے ہیں لیکن اس ابہام کے باوجود بعض علماءِ کرام ان مسلم آبادیوں کو قرونِ وسطیٰ کے ان مسلمانوں سے مماثل قرار دیتے ہیں، جن کے علاقوں پر غیر مسلموں نے قبضہ کرلیا ہو، وہاں کی اکثریت اسلامی علاقوں میں منتقل

ہوگئی ہو اور چند لوگ پیچھے رہ گئے ہوں۔ ان پر قیاس کرتے ہوئے آج کے مفتیانِ کرام اس مفروضہ توقع کے ساتھ کہ یہ لوگ بھی مسلم ممالک میں ہجرت کر جائیں گے، ان کی صورتِ حال کو عارضی قیام قرار دیتے ہیں اور اسی اعتبار سے یہ حکم جاری کرتے ہیں کہ یہ مسلمان اپنے دینی اور ثقافتی تشخص کو صرف اسی صورت میں قائم رکھ سکتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو مقامی قانون، ثقافت اور اقدار سے الگ رکھیں۔ مقامی سیاسیات میں حصہ نہ لیں کہ یہ 'نظام کفر' کے ساتھ تعاون بھی ہے اور اپنے انفرادی تشخص کی نفی بھی۔ اس طرزِ فکر کی نمایاں مثال سعودی عرب کے دو ممتاز مفتیان کرام شیخ عبدالعزیز بن باز اور شیخ عثیمین کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو ''مسلمان اقلیات کے بارے میں فتاویٰ'' کے عنوان سے انگریزی میں لندن سے ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا۔

ان فتاویٰ میں مسلمانوں پر واضح کیا گیا ہے کہ عقیدہ صحیح کی حفاظت اور شریعتِ مقدسہ کے احکام کی پابندی تمام مسلمانوں کی بالعموم اور غیر مسلم معاشروں میں رہائش پذیر مسلم اقلیتوں کی بالخصوص بنیادی ذمہ داری ہے۔ ان فتاویٰ سے ان مسائل و مشکلات کا پتہ چلتا ہے جن کا مسلم اقلیات کو سامنا ہے مفتیانِ کرام سے جو سوال کیے گئے ہیں ان میں قانونی، اقتصادی اور سیاسی مشکلات کے بارے میں رہنمائی طلب کی گئی ہے۔ محترم مفتیانِ کرام نے سائلین کو صبر اور تحمل کی ہدایت کی ہے تاہم ان کو یہ ہدایت بھی کی ہے کہ ''اگر روزی کمانے کے سلسلے میں ایسے امور مثلاً مردوں اور عورتوں میں اختلاط سے جو محرمات میں سے ہیں اجتناب ممکن نہ ہو تو ایسی روزی کو ترک کر دینا واجب ہے۔'' (مسلم اقلیات، ص ۷۵) ان فتاویٰ میں مسلمانوں کو غیر مسلم عورتوں سے شادی کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ عیسائیوں سے دُعا سلام خصوصاً کرسمس اور دوسرے مذہبی تہواروں پر غیر مسلموں سے میل جول کو ممنوع بتایا ہے۔ شادی بیاہ کے سلسلے میں مسلمان غیر مسلم عدالتوں میں جا سکتے ہیں لیکن صرف طلاق کی رجسٹریشن کی حد تک اور صرف اس صورت میں کہ اس میں شریعتِ اسلامی کی خلاف ورزی نہ ہو۔ ان فتاویٰ میں عام طور پر قدیم فقہ اسلام کی پابندی کی تلقین کی گئی ہے۔ بعض صورتوں میں جہاں بعض رخصتوں کی اجازت ہے تو وہ صرف عارضی طور پر اضطراری حیثیت سے۔ مثلاً تصویر اُتروانا یا اس کی اشاعت یا غیر مسلم

حکومتوں کے ہاں فوجی خدمات کی اجازت محض اضطراری ہے۔

شریعت کی پابندی کا ایک تقاضا یہ ہے کہ مسلمان ایک مخصوص طریقے سے مذہبی تنظیم قائم کریں اور اس مقصد کے لیے مفتی حضرات کی خدمات کو رسمی شکل دیں۔ ایسی تنظیم میزبان غیر مسلم حکومت کی اجازت کے بغیر عام طور پر ممکن نہیں۔ چنانچہ کتاب میں بار بار علماء اور مفتیانِ کرام پر زور دیا گیا ہے کہ وہ مسلم اقلیات کے باقاعدگی سے دورے کریں حتیٰ کہ بعض سوال کرنے والوں کی زبان میں ''دارالکفر کا سفر قطعاً ممنوع ہے''۔ شیخ ابنِ باز مسلمان حکمرانوں اور دولت مندوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ دامے درمے سخنے جس قدر ہو سکے مسلم اقلیتوں کی حفاظت کی کوشش کریں۔ ''یہ ان کے واجبات میں سے ہے۔''

دونوں مفتیانِ عظام قدیم اصولِ فقہ اور تصورِ کائنات میں کتنے محدود ہیں، اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ وہ ان ممالک کو جن میں مسلم اقلیتیں رہائش پذیر ہیں ''دشمن ممالک'' گردانتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ان ممالک کو واقعی دشمن نہیں سمجھتے بلکہ غالباً یہ ''حربی'' کا ترجمہ ہے لیکن یہ طرزِ استدلال اس تصورِ کائنات پر مبنی ہے جس کی رُو سے پوری دُنیا دارالاسلام اور دارالکفر میں تقسیم ہے۔

دورِ جدید میں مسلم فقہا عموماً قرونِ وسطیٰ کی ان اصطلاحات کو اہمیت نہیں دیتے۔ اس لیے ان کے نزدیک مسلم اقلیت کی صورتِ حال کو قدیم فقہ میں مذکور احکام پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ جدید فقہا مسلم اقلیت کو دورِ جدید کے نئے مسائل میں شمار کرتے ہیں۔ اس لیے وہ اس صورتِ حال سے پیدا شدہ تمام مسائل مثلاً ذبیحہ کی حلت وحرمت، یورپی لباس، یورپ میں نکاح وطلاق، مخلوط تعلیم اور غیر مسلموں کے ساتھ باہمی تعلقات کو حوادث اور نوازل یا مسائلِ جدیدہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ تاہم ان کے حل کی تلاش میں وہ بھی ضرورت اور اضطرار کے اصولوں سے مدد لیتے ہیں۔ اس لحاظ سے مفتیوں کے نقطہ ہائے نظر میں اختلاف بھی نظر آتا ہے مثلاً بعض مفتیوں کے نزدیک یورپ کے لوگ اہلِ کتاب شمار ہوتے ہیں اور دوسروں کے نزدیک نہیں۔

جدید فقہا میں ایک تیسرا گروہ ہے جو اس صورتِ حال کو استثنائی قرار نہیں دیتا بلکہ یہ ایک ایسی صورت ہے جو مسلم ممالک کو بھی درپیش ہے اور اس کے لیے نئے قواعد و اصول کی ضرورت ہے۔ مصلحہ، روح، قانون، رخصت، تیسیر، عموم بلوی اور سدِ ذرائع وغیرہ کے اصول جو محض مخصوص حالات کے لیے وضع کیے گئے تھے، ان فقہا کے نزدیک اب ان اصولوں کی حیثیت اضطراری یا عارضی نہیں بلکہ مسلم اقلیات کے لیے یہ بنیادی اصولوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے تمام مسائل انہی اصولوں سے طے ہوں گے گویا یہ استثنائی قواعد اب فقہ اقلیات کے لیے اصولِ فقہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ آرا فتاویٰ کی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔

اقلیات کے بارے میں فتاویٰ عام طور پر فقہ یا فتاویٰ کی کتب میں جگہ نہیں پاتے تھے محض ضمنی مسائل کے طور پر ذکر ہوتا تھا، اب تو اسے ایک مستقل موضوع کی حیثیت ہوگئی ہے اور اس نام سے کتابیں شائع ہونے لگی ہیں۔

فقہ اقلیات

اقلیات کے مسائل اور موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے تاہم امریکہ میں مسلمانوں کو احساس تھا کہ ان تمام مباحث اور تصانیف میں اقلیات کے مسائل کو صحیح طور پر سمجھا نہیں جا رہا۔ ۱۹۹۴ء میں شمالی امریکہ کی فقہ کونسل نے ایک منصوبے کا اعلان کیا جس کا مقصد غیر مسلم معاشروں میں سکونت پذیر مسلمانوں کے لیے فقہ کی تشکیل تھا۔ جناب یوسف طلال دی لورنزو نے جو کونسل کے سیکرٹری تھے منصوبے کی تفصیلات بتاتے ہوئے لکھا کہ فقہ اقلیات کے لیے اضطرار کے روایتی قواعد سے ہٹ کر نئے اصولِ فقہ کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے اُنہوں نے کئی مثالیں دیں۔ مثلاً روایتی فقہ میں نکاح کا معاہدہ محض خاوند کی جانب سے طلاق کے یک طرفہ اعلان سے ختم ہو جاتا ہے۔ نئی فقہ میں اس بات پر زور ہے کہ نکاح کا معاہدہ عدالتی نظام کے ذریعے ختم ہو۔

طہ جابر العلوانی نے جو کونسل کے چیئرمین ہیں، غالباً سب سے پہلے فقہ الاقلیات کی اصطلاح استعمال کی۔ ۱۹۹۴ء میں اُنہوں نے ایک فتویٰ دیا جس میں مسلمانوں کو امریکہ کی سیکولر

سیاسیات میں حصہ لینے کو جائز قرار دیا۔ امریکہ میں بعض مسلمانوں کو اس بارے میں تحفظات تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ امریکی سیاسیات میں حصہ لینے سے مسلمان گویا غیر مسلموں کے ساتھ تعاون اور اشتراک یا فقہی اصطلاح میں موالات کی تائید کرتے ہیں۔ اس سے مسلمان تقسیم ہوتے ہیں اور ایک غیر اسلامی 'طاغوتی نظام' کی اطاعت کا اعلان کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس سے یہ غلط اُمید بھی پیدا ہوتی ہے کہ امریکہ دارالاسلام بن گیا ہے۔

کونسل سے استفسار کے جواب میں علوانی نے ان تمام خدشات کی تردید کی۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ امریکی سیکولرزم مذہب کے معاملے میں مکمل طور پر غیر جانبدار ہے، اسے لادینی نہیں کہا جا سکتا۔ اُنہوں نے کہا کہ ان ممالک میں جہاں مسلم اقلیتیں سکونت پذیر ہیں، ان ممالک سے مختلف ہیں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ دونوں ممالک میں صورتِ حالات مختلف ہے، اس لیے احکام بھی مختلف ہیں۔ مسلم اکثریت کے علاقوں میں مسلمان اپنی ریاست میں رائج شریعتِ اسلامی کے پابند ہیں۔ امریکہ میں رہائش پذیر مسلمان فقہ اسلامی کے اعتبار سے بھی اور عقلی طور پر بھی ایک سیکولر ریاست میں اسلامی شعائر کے پابند نہیں۔ یہ پابندی صرف اسی صورت تک ہے جہاں تک مقامی ریاست ان کی اجازت دیتی ہے۔

اس فتوے سے اسلامی دُنیا میں کھلبلی مچ گئی۔ اکثر علماء نے اس کی مخالفت کی اور بحث ومناظرے کا دروازہ کھل گیا۔ شام کے ایک عالم شیخ سعید رمضان البوطی نے اس فتویٰ کی شدت سے تردید کی۔ اُنہوں نے اسے اسلام میں تفرقہ پیدا کرنے کی سازش قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں تو مغرب میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد دیکھ کر خوشی تھی اور یہ اُمید ہو چلی تھی کہ اسلام سے وابستگی اور احکام اسلام کی اطاعت سے وہ برف پگھل جائے گی جو مغرب کی گمراہ تہذیب نے اسلام کے خلاف سردمہری سے پیدا کی ہے اور امریکی تہذیب اسلامی تہذیب میں شامل ہو جائے گی۔ لیکن آج فقہ الاقلیات کی دعوت کی یہ آواز سن کر معلوم ہوتا ہے کہ ہماری اُمیدوں کے برخلاف امریکہ تو آفات کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ اس سے تو یہ خدشہ پیدا ہو چلا ہے کہ امریکہ کی گمراہ تہذیب میں خود اسلام کا وجود پگھلنے کو ہے اور یہ نئی فقہ اس خدشے کو یقین میں

بدل رہی ہے۔

اس تنقید کا جواب دیتے ہوئے طہ جابر علوانی نے واضح کیا کہ فقہ الاقلیات ایک مستقل فقہ کا نام ہے۔ اس کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ شریعت کے اصول اس بات کی ضمانت دیتے ہیں کہ قانون میں ہر معاشرت کے مخصوص زمانی اور مکانی صورتِ حال اور ضرورتوں کی رعایت رکھی جائے گی۔ شریعت اس بات پر زور دیتی ہے کہ ایک فقیہ اور مفتی کے لیے مقامی عادات کا جاننا ضروری ہے۔ اس کے لیے سماجیات مثلاً معاشرتی علوم، اقتصادیات، سیاسیات اور بین الاقوامی قوانین سے آگاہی لازمی ہے۔ روایتی فقہ جس نے واقعہ بہ واقعہ مسائل کے حل کی بنیاد پر نشوونما پائی ہے، ایک جامع نظامِ قانون نہیں ہے جو تمام واقعات کا حل پیش کر سکے۔ فقہ الاقلیات استثنائی یا اضطراری فقہ نہیں ہے جو محض ہنگامی طور پر بعض رخصتوں پر تعمیر ہوئی ہے۔ علوانی کا کہنا ہے کہ دارالاسلام اور دارالحرب کی تقسیم آج کی دُنیا میں بے معنی ہے۔ مسلمان جہاں کہیں بھی ان کو ایک مستقل اور زندہ متحرک معاشروں کی حیثیت دینا لازمی ہے۔

فقہ الاقلیات کی اصطلاح اب خاصی مقبول ہو چکی ہے۔ خالد عبدالقادر غالباً پہلے فقیہ ہیں جنھوں نے ۱۹۹۸ء میں لبنان سے فی فقہ الاقلیات المسلمہ کے نام سے کتاب شائع کی اور اس میں اقلیات سے متعلق تمام فقہی احکام جمع کیے۔ علامہ یوسف القضادی جنھوں نے اس موضوع پر غالباً سب سے زیادہ لکھا ان کی کتاب فقہ الاقلیات المسلمین حیاۃ المسلمین وسط المجتمعات الاخری کے عنوان سے ۲۰۰۱ء میں قاہرہ سے شائع ہو چکی ہے اس کے بعد اس کا انگریزی ترجمہ دو جلدوں میں ۲۰۰۲ء اور ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا۔ انگریزی ایڈیشن میں وہ اس فقہ کو ''پروگریسو فقہ'' یا ترقی پسند فقہ کے نام سے بیان کرتے ہیں۔

فقہ الاقلیات نے بہت سے نئے سوالات کو جنم دیا ہے۔ سب سے پہلے تو اقلیت کی اصطلاح ہے۔ فقہ الاقلیات نے اس اصطلاح کو ایک مستقل حیثیت دے دی ہے۔ یہ اصطلاح اسلامی تاریخ، بین الاقوامی قوانین اور اسلامی تعلیمات کے سیاق میں بہت سی وضاحتوں کا تقاضا کرتی ہے۔ ایک ریاست میں جو قومیت کی بنیاد پر قائم ہو، اقلیت کی اصطلاح ایک قوم در قوم یا

دوسرے درجے کی اقوام کا تصور فراہم کرتی ہے۔ لسانی قومیتیں پھر بھی کوئی سیاسی حیثیت رکھتی ہے، لیکن مذہبی قومیتیں تو بے حد کمزور ہوتی ہیں کیونکہ جغرافیائی وحدت نہ ہونے کی بناء پر وہ یکجا نہیں ہوتیں پھر مذہب اور فرقے کی بنیاد پر وہ مزید تقسیم ہوتی ہیں۔

دوسرے امریکہ اور یورپ میں نسلی اور لسانی اقلیت کا تصور معروف ہے اور اسے بعض اوقات قانونی حیثیت اور مراعات بھی حاصل ہیں۔ مذہبی اقلیت نہ صرف غیر مقبول ہے بلکہ اس تصور سے بہت سے خدشات اور تحفظات وابستہ ہیں۔ اسے قانونی اعتبار حاصل ہونا مشکل ہے۔

تیسرے مسلم اقلیات خود بھی ایک واضح تصور نہیں۔ عام طور پر مسلم اقلیات کا جب ذکر آتا ہے تو صرف امریکہ یا یورپ میں سکونت پذیر مسلمان مراد لیے جاتے ہیں۔ مسلم اقلیات کی زیادہ تعداد امریکہ اور یورپ سے باہر غیر مسلم ممالک میں موجود ہے۔ مثلاً بھارت، تھائی لینڈ وغیرہ کیا امریکہ کی فقہ اقلیات ان ممالک کے مسلمانوں کے لیے کافی ہوگی یا ان میں سے ہر ملک کو اپنی فقہ اقلیات مرتب کرنا ہوگی۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ فقہ اقلیات کے مسائل نہیں ہیں جو مسلم اقلیتوں کے مسائل ہیں نہ ہی یہ ان مسلمانوں تک محدود ہیں جو غیر مسلم ممالک میں رہائش پذیر ہیں اور نہ ہی یہ اقلیتی مسائل ہیں ۔ ہی یہ مغرب یا مشرق کے مسائل ہیں۔ یہ مسائل دراصل بدلتی دُنیا کے مسائل ہیں جو روز بروز عالمی ہوتی جارہی ہے۔ رسل و رسائل اور مواصلات میں تبدیلیوں نے علم اور خبر کی وسعتوں کو سمیٹ دیا ہے۔ زمین کی طنابیں کھینچ رہی ہیں مغرب اور مشرق میں فاصلے ختم ہوتے جارہے ہیں جو مسائل کل تک اقلیتوں کے مسائل تھے، وہ اب اکثریت کے مسائل بھی بن چکے ہیں۔ ان کے عارضی حل ڈھونڈنا کافی نہیں۔ مثلاً پاکستان میں رہنے والا ایک مسلمان صرف پاکستان ہی کا شہری نہیں بلکہ ایک عالمی نظام کا حصہ بھی ہے۔ پاکستان صرف ایک اسلامی ملک ہی نہیں بلکہ اقوامِ عالم کا ایک رکن بھی ہے جو مختلف بین الاقوامی معاہدوں کے تحت اقتصادی، قانونی اور بہت سے دیگر قوانین کا پابند ہے۔ ایک پاکستانی شہری ان معاہدات کے

تحت ایک بین الاقوامی شہری بھی ہے۔ فقہ اسلامی دارالاسلام میں رہنے والے ایک مسلمان اور ذمی کے احکام تو بتا سکتی ہے یا ایک حربی اور مستامن کے حقوق پر تو روشنی ڈال سکتی ہے لیکن اس نئے بین الاقوامی شہری کے کیا حقوق وفرائض ہوں گے؟ ان کا تعین ابھی باقی ہے۔